فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں طنز و مزاح کا المیاتی پہلو

آمنہ بی بی[1]، ڈاکٹر منور ہاشمی **

Abstract:

"In Urdu language and literature entire history of comedy seems to be album of hurrah from tongue and alas from heart. Comedy has been taken as mode of expression whenever the description of the circumstances with In the framework of socio-political milieu confronted to human was undertaken, Farhatullah baig is one of those cheerful and good styled comedy writer who so submerged the account of the world history into his memories that the reader and listeners could not help uttering hurrah on tongue but alas on heart.

Farhatullah baid was a man with good humor and delightful nature. He was inclined to live the bitterness of life with liveliness and cheerfulness that is why in his essays life seen in mirth and gaiety despite all its agonies. He depicts heart rendering and saddening incidents in such lights words that the incidents without being heavy upon emotions, drive minds to think. No doubt the essays of farhatullah baig contain the treasure of tragic aspects of comedy in urdu language and literature."

ادب کی اولین ذمہ داری معاشرے میں ہونے والے خوشگوار یا نا گوار حالات و واقعات کا بیان ہے۔ انسان بیشتر اوقات اپنی رنجاں و نالاں فطرت میں مجبورو رنجور رہتا ہے، اس لیے زندگی کی خوشیوں اور کامرانیوں سے آسودہ کم اور اس کی تلخیوں و رنجشوں سے آزردہ زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسے میں تخلیق کار کا فرض ہے کہ زندگی کے غم و الم اایسے شستہ و شائستہ انداز میں بیان کرے کہ دلگیر و دلسوز حالات و کیفیات ذہن و دل پر بوجھ بھی نہ بنیں اور انسانی اذہان پر تفکر کے در بھی وا ہوتے چلے جائیں۔اردو ادب میں بیشتر طنزیہ و مزحیہ تخلیق کاروں نے بلاشبہ اپنی فنی و فکری اُپج سے درپیش انسانی المیاتی حقائق کو خوش مزاجی اور خوش اسلوبی سے بیان کرنے کا حق اداکردیاہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار بھی اردو ادب کے ایسے ہی عظیم تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو ا ردو فکاہی ادب کی تاریخ میں اپنے شگفتہ اسلوب کی وجہ سے ہمیشہ زندہ ء جاوید رہیں گے۔ نپی تلی، شوخ و چنچل اور دلربا چاشنی فرحت اللہ بیگ کے مضامین کی جان ہے جو بہت کم آپ سے اگلے اور پچھلوں کے حصے میں آئی ہے۔ فرحت اللہ بیگ فطرتاً شوخ اور ہنسوڑ طبیعت کے مالک تھے۔ز ندہ دلی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔وہ زندگی سے ہر آن لطف اٹھانا جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں زندگی کی شوخیوں اور رنگینیوں کا ذکر شگفتگی اور رنگینی کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ میلوں ٹھیلوں، تماشوں، سیرو سیاحت، تقریبات، جلسے جلوسوں اور ان کی رونقوں کے اظہار میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس میں ان کی شوخ و چنچل شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔کمال کی بات یہ ہے کہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج شخص کی تحریر کا ہر لفظ اپنے اندر ایک حزنیہ انگ بھی لیے ہوئے ہے اور بلاشبہ فرحت کے مضامین زبان سے واہ اور دل کی آہ کا مرکب ہیں۔

نذیر احمد کی کہانی، دہلی کا اک یادگار مشاعرہ، پھول والوں کی سیر، میں دلّی کی اعلیٰ

---

[1]پی ایچ ڈی اسکالر، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون،سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آبا د
**چیئر مین اردو ڈیپارٹمنٹ، نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ

اقدار و روایات کی حامل شخصیات کی مرقع نگاری سے وہ کبھی اپنے دل کے ارمان نکالتے ہیں تو کبھی دلی کی آزردہ حالی پر اپنے دل کا نوحہ اس کی رنگین یادوں کے بیان میں سناتے ہیں۔

زردہ بدستِ زندہ، غلام، صاحب بہادر جیسے مضامین میں ان گم گشتہ روایات و اقدار ا و راخلاقیات و عقائد کا ذکر کرکے خود کو بہلاتے ہیں جن کی وجہ سے دلّی دلّی تھی۔ دلّی کی یاد ہی فرحت اللہ بیگ کی ہنسی اور آنسوؤں کی وجہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا مادرِ وطن تو دلی تھا لیکن معاشی و ذاتی مسائل اور صحت و تقدیر کی رضا سے عین شباب میں لکھنو میں آکر بسنا پڑا تو تصو رو تخیل میں ہی سہی بقیہ تمام عمر انھوں نے دلی کے گلی کوچوں کی یاد میں گزار دی۔فرحت کے مضامین میں شگفتہ مزاجی اپنی جگہ لیکن ذکر اسی ماضی کے عذاب کا ہے، اسی احساسِ محرومی اور کرب ناک غم و اندوہ کا ہے،جس کی یاد تمام عمر آپ کے سینے میں سلگتی رہی۔

نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی میں نذیر احمد کے بارے میں شگفتہ و آموختہ جو کچھ لکھا گیا اس کی ردو قدح اپنی جگہ مسلم،لیکن تہہ داری میں بات اس نابغہئ روزگار دلی والے اور دلی ہی کی ہے جس کی شخصیت میں دلی کی روایات و اقدار، تہذیب و معاشرت رچی بسی تھی۔

عالم بے کسی و بے بسی میں اپنے دل کے پھپھولے ان الفاظ میں پھوڑتے ہیں۔فرحت اللہ بیگ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہائے کیا کہوں جب دلّی یاد آتی ہے تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے،نہ وہ اب محبتیں رہیں نہ وہ صحبت، نہ دلی والے رہے،نہ وہ زندہ دلی،نہ وہ بے فکری رہی، نہ وہ وضع داری۔ کوئی گھر نہ تھا جہاں روزانہ کمسے کم دوچار دوست جمع نہ ہوجاتے ہوں، گھر میں جگہ نہ ہوتی تو کیاپروا ہے دل میں تو جگہ تھی۔ سڑک پر ہی مونڈھے بچھ جاتے، جب منگوکے چھتے سے گزر جاتا ہوں تو پرانی صحبتیں یا د کرکے دل بیٹھ جاتا ہے۔''(۱)

مضامین فرحت میں فرحت کے دل کی حسرت کا ہی نہیں دلی کا بھی المیّہ چھایا ہواہے۔خاص طور پر اس ہائے میں کیا کہوں؟ میں، اس کے بعد دلّی کو یاد کرتے ہیں تو پھردلّی کا ہی مرثیہ سناتے ہے۔ دلی تہذیب و معاشرت و ثقافت کا گہوارہ تھا اور بیشک کہ دلی کو اس کی زندہ دلی کے ہاتھوں کئی بار نظرِ بد کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ ہر خاص و عام نے دلی کے ٹمٹماتے چراغوں کی لو سے خود اپنے گھروں میں چراغاں کیا لیکن یہ زندہ دلی، دلی کے حصے میں ہی آئی کہ رات کتنی ہی اندھیری کیوں نہ ہو اگلی صبح وہ پھر زندگی کی شادابیوں میں تر وتازہ اور روشن نظر آئی۔ دلّی والوں کے دن میلوں ٹھیلوں میں،ریتوں رواجوں میں،راتیں کبھی علم و فضل کی محفلوں اور کبھی مشاعروں میں گزرنے لگتیں۔

نذیر احمد کی کہانی اک یادہی نہیں بلکہ ایک مرثیہ اور ایک نا بغہئ روزگار کا المیہ بھی ہے کہ کیسے عالی وقار کو کیسے دگرگوں حالات سے گزرنا پڑا۔ موت ایک زندہ حقیقت ہے ہر نفس کوموت کا مزا چکھنا ہے لیکن انسان اپنے نسیان کی وجہ سے بہت جلد اپنے محسنوں کے احسانوں کو بھلا بیٹھتا ہے اور یہ بھی ایک اجتماعی انسانی المیہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر پر مٹی، مرنے والے پر کم اور زندہ انسانوں کے احساس پر زیادہ پڑتی ہے لیکن نذیر احمد کے یہاں معاملہ الٹا ہے۔ نذیر احمد کا احساس تھا کہ انھوں نے جس شخص سے جو لیا اسے بدرجہ ہا بہتر صورت واپس کیا۔ یہ سلوک صرف شخصیات کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مقامات کے ساتھ بھی روا رکھا۔یہی وصف ان کے شاگردِ خاص فرحت اللہ بیگ میں بھی تھا۔ دلّی فرحت اللہ بیگ کا جائے پیدائش و رہائش رہا۔ رزق کے بکھیڑے انھیں لکھنؤ تو لے گئے لیکن دلی کے ساتھ جو جذباتی وابستگی تھی وہ تاحیات قائم رہی یہی وجہ ہے کہ مضامینِ فرحت میں کوئی مضمون اٹھا لیں اگر دلّی والے کا تذکرہ ہے تو بات دلی کے گلی کوچوں، میلے ٹھیلوں بازاروں سے ہی شروع ہوتی ہے اور اگر دلی کا ذکر ہے تو پھر تو ہے ہی کمال بات، دلی کا ذکر اور فرحت کا قلم،اللہ دے اور بندہ لے والا حساب نظر آتا ہے۔

اردو زبان و ادب میں نذیر احمد کی کہانی کو ایک جیتے جاگتے مرقع کی حیثیت حاصل ہے۔ فرحت کی اس کامیابی میں کاوش سے زیادہ نیت اور خلوص کا عمل دخل ہے وہ ایک سچے

استاد کے کھرے طالب علم تھے اس لیے کھرے کھوٹے کی پہچان ان کی شخصیت میں مجتمع تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب جو کچھ کانوں سے سنا او رآنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اوربے دھڑک لکھوں گا۔ خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کردوں گا، تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویرکھنچ جائے او ریہ چند صفحات ایسی سونح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانےکو لکھی گئی ہو۔''(۲)

فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کی یہ سچائی اور نیت کا خلوص صرف نذیر احمد کی کہانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے مضامین میں جس بھی موضوع پر قلم اٹھایا اسے خلوصِ دل سے لکھا۔ اپنے استاد محترم کے بیان میں بطور خاص اپنے قلم اور دل کی سچائی کی بابت خود بھی وضاحت کرتے ہیں:

''میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدانِ حشر میں سود در سود لگا کرخود تاوان وصول کر لیں گے۔''(۳)

فرحت اللہ بیگ کا فن کی بابت یہی روّیہ تا حیات رہا۔ انھوں نے ہمیشہ علم و فن کی عدالت میں خود کو جواب دہ پایا اور سمجھا یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں واقعات کی صداقت جودیگر حوالوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے ان کی فنی صداقت کا ثبوت ہے مثلاًنذیر احمد کی کہا نی میں ڈپٹی صاحب کی شہرہ آفاق تخلیقات کے ذکر میں مسٹر کیمپ ڈائریکٹر تعلیمات کا اتفاقاً مراۃ العروس پڑھنے اور چھپنے کا واقعہ بعینہٖ ویسا ہی بیان کردیا جیسا کہ خود محمد زکریا نے نذیر احمد کے بقول اپنی کتاب میں پیش کیا۔اسی طرح کالج میں داخلے کا ذکر ہو یا مولوی صاحب کی خوش خوراکی کا تذکرہ،فرحت اللہ بیگ نے فنی و اخلاقی سچائی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اپنے اظہار کے لیے اسلوب اورطرزِ تحریر کی بابت لکھتے ہیں:

''اب رہا طرزِ بیان، تو اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیوں کہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا، ان کا منہ چڑانا ہی نہیں، ان کی توہین کرنا ہے۔''(۴)

اسی طرزِ اسلوب کی وجہ سے فرحت اللہ بیگ نے تمام عمر مولوی صاحب سے داد پائی تھی۔شگفتہ مزاجی اور شوخی ان کی فطرت کا حصہ تھی اسی لیے اگر پندو نصائح کی باتیں بھی وہ اسی متانت اور برجستگی میں کہہ گئے ہیں کہ باوجود تلخ حقائق کے بری معلوم نہیں ہوتیں۔ فرحت اللہ بیگ کا مقصد بھی تھا کہ وہ ایسی نابغہ روزگار ہستیوں کے احوال صداقت اور دیانتداری سے بیان کر جائیں کہ جن کی بنا پر نہ صرف زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کے نام زندہ رہ جائیں۔ فرحت کا کمال یہ تھا کہ وہ پندونصائح کی باتیں عمل سے بیان کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ قاری ان کے مضامین سے سبق حاصل کرے اور اپنے اخلاق و کردار کو بہتری کی طرف توجہ کرے۔ وہ اعلیٰ شخصیات کے اعلیٰ اوصاف کا ذکر بھرپور عالمانہ انداز سے اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کو بات سمجھتے ہی بنتی ہے۔

وقت کی پابندی ایک ایسی صفت ہے جو دنیا کے عظیم آدمیوں کی مشترکہ خصوصیات کی اگر فہرست بنائی جائے تو یقینا یہ خوبی باہم مشترک ملے گی۔ مولوی صاحب کے حلیے اور لباس کی بات کرتے ہیں تو بطورِ خاص ان کی وقت کی پابندی کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی یورپ اور مغرب پسند لوگوں پر طنز بھی کرجاتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''بعض یورپ پسند پابندی اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ صرف دہلی میں میں نے تین ایسےاشخاص دیکھے ہیں جو آندھی آئے، مینہ آئے روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری آتے تھے۔ ایک منشی ذکاء اللہ، دوسرے رائے بہادر اور تیسرے مولوی صاحب۔''(۵)

سحر خیزی، نماز کی پابندی، خوش دلی اورخوش خوراکی مولوی صاحب کے اوصافِ حسنہ تھے۔ فرحت اللہ بیگ اپنے استاد کی خوبیوں کا ذکر فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔مولوی صاحب کے نمایاں اوصاف اورلباس کی بابت لکھتے ہیں کہ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا

فرق تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی:

''وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے، ان کو جس طرح آرام ملتا، اسی طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے نہ جی چاہتا نہ پہنتے۔''(۶)

دوسری وجہ یہ تھی کہ ان سے ملنے ان کے طالب علم آتے یا صاحبِ کمال، ادیب و دانش ور، جن کا مادیت پرستی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔جن کی توجہ ظاہر پر نہیں باطن پر ہے۔

''ایسے صاحبِ کمال ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں۔''(۷)

وہ گھر کے لباس میں اپنی سہولت کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کے باہر کے لباس اور وضع قطع کے بارے میں ان کے خیالات فرحت اللہ بیگ یوں بیان کرتے ہیں:

''کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا۔''(۸)

مولوی صاحب نے اپنی زندگی مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے کاموں میں صرف کی۔ وہ برصغیر میں مسلمانوں کی دگرگوں حالت کو ان کی اپنی کاہلی، سستی اور غفلت سمجھتے تھے۔ علم کا حصول نوکری کے لیے ہو تو صرف نوکرہی پیدا ہوتے ہیں عالم نہیں،ا سی لیے نذیر احمد نے ہمیشہ نوکریوں کی مخالفت کی۔ مولو ی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اس لیے قرض دیتے اور بے دریغ دیتے تھے۔وہ انھیں اپنے پاؤں کھڑا دیکھنا چاہتے تھے لیکن مسلمان قوم کا المیہ تھا کہ وہ جس شاخ پر آشیانہ تھا اسی کو کاٹنے کی فکر میں لگے رہے اور اکثر مولوی صاحب بڑی بڑی رقمیں ڈبو دیتے تھے۔ نذیر احمد کی ایک اور خوبی کا ذکر بھی فراخدلی سے کرتے ہیں

''کہ ا گر واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرض دار کا نقصان ہوجاتا یا دیوالیہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے۔''(۹)

1857ء کی جنگِ آزادی میں انگریز کے مسلمان دشمنی کے خونریز واقعات برصغیر کی تاریخ کے دل کا ہی نہیں، انسانی فطرت اورانسانی تاریخ کے دامن پر بھی داغ ہیں۔ نذیر احمد ان حالات سے خود بھی گزرے تھے،بڑے بڑے شرفاء و ارفع جو ایک ٹھوکر میں راہ گیر اور فقیر ہو گئے تھے،نذیر احمد ان پر بیتی کے چشم دید گواہ بھی تھے اور اکثروبیشتر نجی محافل میں بڑی درد مندی سے اس بیتی کربناکی کا ذکر بھی کرتے تھے۔مسلمانوں کی بدحالی میں چھپی تلخ حقیقت اور المیّے کو ڈپٹی صاحب کی زبانی فرحت اللہ بیگ نے بھی جا بجا بیان کیا ہے۔

اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اسی سلسلے میں اکثر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفاء دہلی پر اس طوفانِ بدتمیزی میں گزری تھی اس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے، اکثر کہا کرتے، میاں بیچارا بہادرشاہ مجبور تھا کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔(۱۰)

یہی مغلیہ بادشاہت کا المیہ تھا کہ شاہانہ وقار اور عظمت انگریزی سرکار کے وظیفہ کا مرہونِ منت رہ گیا تھا۔ مولوی نذیر احمد خود بھی انگریزی تہذیب کے بہت بڑے ناقد تھے اور اس کے اثرات نوجوانانِ ہند میں دیکھ کر کڑھتے بھی تھے۔ انھوں نے اصلاحی و مقصدی ناول لکھ کر قوم کی فلاح کی کوشش بھی کی۔ فرحت اللہ بیگ اپنے استاد کے اس نظریے کے پیروکار تھے۔ ایک دفعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب کے مغرب پر تنقیدی خیالات کو اُن کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

''ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ ان کے پاس صرف ایک یورپ ہے کہ یورپ والے ایسے پہنتے ہیں او ربھئی ہے بھی یہی بات۔ قسمت نے ہم کو انگریزوں کے ماتحت کردیا ہے ان کی ہر چیز ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے اور ان کا ہرفعل ہمارے لیے چراغِ ہدایت۔''(۱۱)

نظریات کے علاوہ فرحت پر مولوی نذیر احمد کی نثر کے محاسن کااثر بھی واضح نظر آتا ہے۔ آپ کے مضامین کا پہلا مقصد اصلاحِ معاشرت کا پرچارر ہا اس طرح مولوی نذیر احمد بھی پہلے مقصدی ناول نگار ہیں۔ مولوی صاحب کے زبان و بیان میں خوش مذاقی اور پندونصائح کا یہی انداز آپ کے ہاں بھی رائج ہے۔ مولوی نذیر احمد ہی کی طرح آپ کے ہاں تراکیب سازی،جزئیات

نگاری، واقعات نگاری، مرقع نگاری، دلی کے کرداروں کے لہجے کے ا تار چڑھاؤکے ساتھ ٹکسالی، شستہ و شائستہ زبان کا استعمال،عربی و فارسی تراکیب اور جا بجا اشعار کی صورت اظہارِ خیال کرنا قدرِمشترک ہے۔ فرحت اللہ بیگ ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے، فن اور ماہرینِ فن کی قدر کرنا خوب جانتے تھے اور ان کے بیشتر مضامین اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں۔

دہلی کا اک یادگار مشاعرہ،1621ھ

دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ فرحت کے نمائندہ مضامین میں سے ایک ہے جو ان کی اس کوشش کا بیان ہے جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''اردو کے لیے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے محسنوں کی شکلیں خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کو صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔''(۱۲)

فرحت اللہ بیگ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان نابغہء روزگار شخصیات کے ایسے مرقع تخلیق کر جائیں کہ رہتی دنیا تک ان کے کلام کے ساتھ ان کے نقوش بھی انمٹ رہیں اور بہت حد تک وہ اس مرقع کشی میں کامیاب رہے۔ مذکورہ مضمون میں اس زمانے کے جید اساتذہ فن و شعر مثلاً غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ اور داغؔ وغیرہ کا نہ صرف حلیہ،چہرہ مہرہ بتایا ہے بلکہ اُن کے طرز لباس،مصروفیات، روزمرہ معمولات، شاگردوں کی فوج ظفر موج، پڑھنے کے ڈھنگ، اندازِ نشست و برخاست، طرزِ گفتگو، آپس کے تعلقات ا ور دوستیوں کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کو مرقع نگاری میں کمال حاصل تھا۔ جزئیات نگاری، شگفتہ اور شستہ زبان و بیان سے جیتی جاگتی،بولتی باتیں کرتی محرک تصویر قاری کے ذہن و دل میں اتار دیتے ہیں کہ پھر قاری کے لیے صاحبِ مذکور کی شخصیت اجنبی نہیں رہتی۔اسی فن کا کمال کا دہلی کا مشاعرہ،شعرا اور مشاہیر کے جیتے جاگتے مرقع ہیں۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''فرحت اللہ بیگ کے مضامین ایک دل کش اور شگفتہ ادبی اسلوب میں ایک خاص عہد کی دلی کے تہذیبی و ثقافتی تصورات کا ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں وہاں کے تمدنی و معاشرتی اوصاف واطوار، طرزِ احساس، مجلسی زندگی کے ادب آداب، تعظیم و تکریم، نشست و برخاست اور ظاہر داری کے جملہ پہلو پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔''(۱۳)

دہلی کا یادگار مشاعرہ مشاہیرِ دہلی اور دلی کی یاد کے مرثیے کا ہی ایک قطعہ ہے جس میں فرحت کی تان تذکرہ دلی پر ہی آن کر ٹوٹتی ہے۔ شعرا اور مصاحبوں کے تذکروں کی صورت انھوں نے دلی کے مزاج، رکھ رکھاؤ، شرفاء کی محافل کا تقدس و حرمت اور بادشاہ کی شان و شوکت و جاہ و حشمت کو بھی ایسے ذہن نشین کرایا ہے کہ گویا دانستہ وہ ذہنوں میں دلی کی عظمت کی تاریخ رقم کر رہے ہوں۔ بادشاہ بہادر کادربار، جو اب تنزل اور پستی کے آخری زینوں پر پہنچ چکا تھا، اس کا حال سنایا ہے اوراساتذہ فن اور ان کے شاگردوں کی اطاعت کے تذکرے بھی بیان کیے ہیں جودلی کی تہذیب میں بسی اہلِ ہنر و فن کی قدردانی کو ظاہر کرتے ہیں۔فرحت جب کسی شخص یا مقام،جاندار وبے جان کی مرقع کشی کرتے ہیں تو ظاہر میں تو اس کی مرقع نگاری کے پیچھے ان کے دو مقاصد بطورِ خاص کار فرما نظر آتے ہیں۔ایک مذکور کی عظمت و رفعت کا احساس دلانا،دوسرے اسے تحریر کی صورت تاریخ میں محفوظ کرنا تاکہ آنے والوں کے لیے صاحبِ مذکور ایک اثاثہ کے طور پر موجود رہے۔

مشاعرے میں حویلی کی سجاوٹ کا تذکرہ بھی مردہ روایات کو آنے والی نسلوں کے لیے بیان کے زور سے جاودانی بخشنے کی ایک کوشش ہے کہ اگر کسی کو خاندانِ سلاطین اور اہلیانِ دہلی کے رہن سہن، وضع قطع اور تہذیب و ثقافت کو جانچنا، پرکھنا، سمجھنا یا محض مشاہدہ کرنا مقصود ہو تو تاریخ کی کتابوں کے ساتھ فرحت کے یہ تین مضامین نذیر احمد کی کہانی، پھول والوں کی سیر اور دہلی کا یاد گار مشاعرہ کے صفحات بھی ضرور سامنے رکھے تاکہ اُسے حقائق زندہ اور مجسم صورت میں اپنے سامنے چلتے پھرتے محسوس ہوں۔ لکھتے ہیں:

''مبارک النساء کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں،قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر

گلزار ِآتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔''(۱۳)

مٹتی تہذیب کے چراغوں میں اس قدر رونق اور رنگینی تھی کہ اس دور کے زندوں میں بھی نہ ہوگی۔گئے دنوں کا سراغ، بیتی محفلوں کی رعنائیاں،کھوئے ہوؤں کی جستجو، ماضی کے گم شدہ اوراق کی باز آفرینی اور بھولی بسری تہذیب کی منظر کشی یوں کی ہے کہ بے جان اشیا ء بھی سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔مشاعروں کا رنگ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تختوں پر دری، چاندی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوس، ہانڈیوں، دیوار گیروں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ مکان بقعہ نور بن گیا تھا جو چیز تھی خوب صورت اور جو شے تھی قرینے سے۔''(۱۵)

باورچی خانوں میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بہ جا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مؤ دب کھڑے تھے۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی۔حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا کہ ابھی دکان پر سے اٹھ آئے ہیں۔(۱۶)

اردو شعر و ادب عالم میں جس عروج کا تخت نشین رہا ہے،اس کی تخلیق میں اساتذہ فن کاخونِ دل شامل ہے، بلا مبالغہ ادب کی آبیاری میں ان کہنہ مشق اساتذہ کو نہ صرف نجی و ذاتی زندگی میں مصائب و آلام دیکھنے پڑے بلکہ حاسدوں اور بخیلوں کی ریشہ دوانیاں بھی شاملِ حال رہیں لیکن کمال وصف دیکھیے کہ ان جانبازوں نے ادب کے اعلیٰ معیارات اور علم و فن کے عروض و محاسن پر کسی قسم کا سمجھوتا در خوراعتنا نہ سمجھا۔

فرحت اللہ بیگ علم و ادب کے معیار اور شعرو ادب کی قدرو اہمیت کی نسبت ان کے روّیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بڑے بڑے مشاعروں میں،میں نے دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو جوش و خروش نہیں رہتا بلکہ خوشی کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ استادوں کے انھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابلِ تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کر دی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جن کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہئے۔ ''(۱۷)

مزید لکھتے ہیں:

''مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے، کچھ حاصل بھی کرلیتے ہیں اور ان کے لیے یہ غزلیں کسی طرح استاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔''(۱۸)

شعرائے ادب کا تذکرہ بلاشبہ دل میں اک آہ بھی بیدار کرتا ہے کہ اگر علم و فن کی بابت یہی روّیہ تاحال برقرار رکھا جاتا تو آج اُردو زبان کی وقعت و عزت کچھ اور ہوتی۔

دلی کا یاد گار مشاعرہ میں فرحت نے ہلکے پھلکے انداز میں نئے اور نومولود شعرا کی مسروقہ شاعری کا بھی تذکرہ کیاہے اورڈھکے چھپے انداز میں شہزادوں اور امیر زادوں کے اس روّیے پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے اساتذہ کا کلام ہی اکثر مشاعروں میں پڑھتے تھے یا اساتذہ کے ہاتھوں کلام میں اس قدر اصلاح ہوتی کہ وہ کلام نوآموز شاعر کا باقی نہ رہتا تھالیکن ساتھ ہی علم و ادب کے وقار، تمکنت کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں صاحب ِ دولت و مملکت رکھنے والے بھی خود کو شاعر و ادیب کہلوانا باعثِ صد افتخار سمجھتے تھے۔لکھتے ہیں:

''ان کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی چالیس برس کے ہوں گے۔ان کی شاعری کی قلعے میں بڑی دھوم ہے خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا تذکرہ دیکھ رہے ہیں مگر مشہور ہے کہ الف سے لے کر ی تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے کہ یا جھوٹ؟ خدا بہتر جانتا ہے۔''(۱۹)

دلی کا ایک یادگار مشاعرہ حالات و واقعات کی مینا کاری اور تشبیہات و استعارات سے مرقع ایک رنگین داستان کے بیان کے ساتھ ایک عظیم عہد کی یادگار کے مٹتے نقوش کا دل آویز و دل گیر المیہ بھی ہے جو بلاشبہ آنے والوں کو خوش ہو نے اور فخر کرنے کے مقامات فراہم کرتا

ہے اورساتھ ہی فرحت نے شگفتہ اسلوب کے درپردہ تلخ حقائق پر آزردہ ہونے، موجودہ ناکامیوں و نامرادیوں کی وجہ بھی بتائی ہے اور دگرگوں حالات کے اسباب پر غورو فکر کی سرِعام دعوت بھی دی ہے۔

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر

فرحت کا تیسرا بڑا مرثیہ ہے جو انھوں نے دلی جیسی عظیم سلطنت کی یادگار کے طور پر اردو ادب میں اثاثہ کے طور پر چھوڑا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کی اس تحریر سے بادشاہ ظفر کے بادشاہی وصف، عظمت و وقار سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ تاریخ کی کتابوں کے برعکس فرحت کے مضمون میں بادشاہ ظفر کی درباری زندگی میں خوش دلی، رعایا سے محبت اور روایات سے عشق جھلکتا ہے۔ رعایا سے محبت اور حسن سلوک خاندانِ تیموریہ کا نمایاں وصف تھا جو اس مٹتی بادشاہت کے اہم آثاروں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ فرحت لکھتے ہیں:

''دلی کاسرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں پامال ہوچکا تھا اورفلاکت کی بجلیوں اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے سلطنتِ مغلیہ کی شوکت و اقدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہیں تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرے۔''(۲۰)

دلی کو فتح کرنا اس کے روایات و اقدار کو تو دور کی بات اس کے درو دیوار کو حصار میں لینے کے لیے انگریز حکمرانوں کو سالوں سازشیں کرنا پڑیں تب کہیں جا کر علم و ادب کا گہوارہ، جاہ و جلال و بادشاہت کا یہ ہفتِ اقلیم سر ہوا۔ بادشاہ اور دلّی کے تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں

''بہرحال یہ بڈھوں کی ودیعت تھی جو میں نے آپ تک پہنچا دی،ا ب چاہیں آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں۔''(۲۱)

بڈھوں کی ودیعت جو فرحت نے اپنے جادوئے فن سے امر کردی یقینا آنے والوں کے لیے ایک نادر و نایاب تہذیب کے آثار کے ساتھ ساتھ نمونہئ عبرت بھی ہے۔

پھول والوں کی سیر میں فرحت اللہ بیگ نے جس دلی کی تصویر دکھائی ہے وہ واقعی خوشی، رونق اور سکون و اطمینان میں بمثلِ جنت معلوم ہوتی ہے اور انسان سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے بھلا ایسی شاندار سلطنت کو بھی زوال آ سکتا ہے۔ جہاں خوش رہنے کے لیے لوگ وجہ نہیں ڈھونڈتے بلکہ خود سے نت نئے طریقے ایجاد کرکے نہ صرف خود خوش و مطمئن رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ان خوشیوں میں شریک کرتے ہیں۔جہاں پھول ہیں، بہاریں ہیں، جھرنے ہیں، جھولے ہیں، قہقہوں کی جھنکار ہے، گل بدن شہزادیاں ہیں، خوبروشہزادے ہیں، لونڈیاں ہیں، غلمان ہیں، دل بہلانے کو کوئل کی طرح کوکتی مغنیاں ہیں، کرتب دکھانے کو گھڑسوار، تلوار باز، تیراک ہیں لیکن ساتھ ہی فرحت اللہ اپنے مضامین عالم کی بے ثباتی اور ناپائداری کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ سدا وقت ایک سا نہیں رہتا۔

ہر عروج کو زوال ہے کہ مصداق،عالم کی بے ثباتی تو یقینی ہے لیکن اپنے زوال سے پہلے عروج کے آسمانوں کو چھو لینا ہی اصل کمال ہے۔

پرانی اور نئی تہذئب کی ٹکر

نئے اور پرانے کی بحث اتنی قدیم ہے جتنی کہ نسلِ انسانی کی تاریخ دیرینہ سال ہے۔ انسانی فطرت میں چیزوں کا باہم تقابل ہر آن رواں دواں ہے۔ پرانے سے پیار اور نئے کو قبول کرنے میں تامل بھی عین فطرتِ انسانی ہے۔ اس پر فرحت لکھتے ہیں:

''انگریزی کی ایک مثل ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں نہ ملیں گے، جس طرح یہ صحیح ہے اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہئے کہ ماضی ماضی ہے اور حال حال۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے۔''(۲۲)

فرحت اللہ بیگ کو نوابوں اور مصاحبوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا تجربہ تھا۔ نوابوں کی زندگی نے باوجود یہ کہ زمانے کی مار کھائی تھی کہ جو پہلے تمکنت، رتبہ، جاہ و جلال تھا، عظمت و حشمت تھی اور رعب و دبدبہ تھا۔ نئی تہذیب، نئی تعلیم اور نئے خیالات نے

بہت حد تک ان کا اثر کم کردیاتھا لیکن اس ترقیِ معکوس، مفلوک الحالی میں بھی بہت سے ایسے نوابانِ دلی اور لکھنؤ میں پرانی تہذیب کے چراغ ہاتھ میں لیے ابھی روشن تھے۔ یہ زمانہ شناس لوگ پرانی تہذیب کی علامت تھے۔ فرحت پرانی تہذیب کے دلدادہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں ان نوابوں کے تذکرے جابجا مل جاتے ہیں یا یو ں کہیے کہ جب فرحت اللہ بیگ کو مسلمانوں کا ماضی او راس کا طنطنہ دکھانا مقصود ہو وہ انھیں کے تذکروں سے کلام کرتے ہیں۔

نوابوں کے مصاحبین اور وہ بھی خوشامد کرنے والے نہ ہوں تو نوابوں کی نوابی کا حال بھی جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا جیسا ہو،نئی تہذیب میں نواب تو آئے لیکن مصاحبوں کی خوشامد پسندانہ طبیعت نے یہاں لگا نہ کھایا کیونکہ نئی تہذیب میں نئی تعلیم کی ضرورت تھی اور تعلیم کے لیے نوابی چھوڑنی ضروری تھی۔ مضمون میں ایسے ہی نواب بچے کی کہانی بیان کی ہے جو بغیر مصاحبوں کے تعلیم حاصل نہ کر سکتا تھا لہٰذا تعلیم چھوڑ دی۔ فرحت نے اسی دوہرے تقاضے کو خوش اسلوبی اور مزاحیہ طرز میں بیان کیا ہے کہ تہذیب و اقدار پرانی اور نئی تعلیم کا حصول دو متضاد روّیے ہو گئے ہیں اگر نئی تعلیم حاصل کرنی ہے تو پھر بعض پرانی عادات کو چھوڑنا پڑے گا۔

مردہ بدست زندہ زندہ انسانوں کی اپنے مردہ انسانوں سے جو صرف دوچار گھڑی بھر دنیا کے مہمان رہ جاتے ہیں ان کی طرف بے اعتنائی اور بے پروائی کا تذکرہ انسانی فطرت کی بے حسی کے المیّے میں بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر مر گیا۔ جنازے کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔''(۲۳)

نئی تہذیب اور نئی تعلیم نے انسان کو ترقی یافتہ تو بنا دیا لیکن عقائد ونظریات، روایات اور احساسات سے بے بہرہ کردیا۔ مادیت کی دوڑ میں انسان کو مرنا یاد نہیں،دوسرے کے غم کو محسوس کرنا تو دور کی بات ہے۔ اس پر بے حسی کا یہ عالم ہے کہ غم میں شریک ہونے کا بھی وقت نہیں۔ فرحت نے اپنے مضمون میں اسی انسانی بے حسی کی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ موجودہ معاشرے میں ظاہر داری، ریاکاری دو بڑی خوبیاں بن کر سامنے آئی ہیں۔ مردہ بدست زندہمیں فرحت اللہ بیگ نے معاشرتی بے حسی اور اجتماعی غفلت کی حقیقت نگاری کی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''برستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے؟ اچھاخاصا اک جنگل ہے۔''(۲۴)

انسانی خود غرضی پر ایک اور تازیانہ لگاتے ہوئے جس حصے کا تعلق زندہ لوگوں سے ہے اس کی بابت یوں توجہ دلاتے ہیں۔

> ''جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دکان دار اپنی ایک ایک چیزجھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں۔''(۲۵)

فرحت اللہ بیگ کی تنقید کا طریقہ دوسروں سے تھوڑا مختلف ہے۔ وہ سائنس کی طرح پہلے علم پڑھا کر پھر تجربہ کرنے کو نہیں کہتے بلکہ پہلے تجربہ، مشاہدہ بیان کرکے پھر اس کا نتیجہ اخذ کرنے کا کام قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پھیلتی اخلاقی بیماریوں کے اثرات دکھاتے ہیں،ان میں مبتلا لوگوں کی حالتِ زار دکھاتے ہیں اور عبرت حاصل کرنے اور راہِ راست طے کرنے کاکام قاری کے حوالے کر دیتے ہیں۔

مضمون غلام میں بھی وہ انسانی نفسیات کے بخیے ادھیڑتے نظر آتے ہیں کہ کیسے ایک عام دماغ نت نئے طریقوں سے صرف خود کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے مالک کے ساتھ دھوکا کرتا ہے اور اس حقیقت کا ادراک بھی کرواتے ہیں کہ یہی معاملہ انسان خدا کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہے اسی لیے وہ ذلیل و خوار ہورہا ہے۔ دنیا ایک ایسی جا ہے جو سراسر دھوکا ہے اس عالم میں بچہ عین فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن لوگ اپنی طبیعتوں کے سبب اس میں زہرناکی، نفرت،

دھوکا دہی جیسے عناصر کی آمیزش کردیتے ہیں۔ غلام ایک ایسے ہی بچے کی کہانی اورمعاشرتی بے حسی کا المیہ ہے جو چھوٹے چھوٹے مکر و فریب سہتے سہتے خود بھی مکرو فریب، جعل سازی اور جھوٹ کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

ایک اور مضمون دام خیال کی شروعات غالب کے شعر سے کرتے ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہئ دامِ خیال ہے(۲۶)

روحانیت کٹ چھنٹ کر اب مادیت رہ گئی ہے اور امراض دیوتاؤں کے رتبے سے گھٹ گھٹا کر کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں ہر مرض کا ایک الگ کیڑا ہے اور ہر آزار کا ایک جدا جرثومہ۔(۲۷)

انسانی دماغ کارخانہئ قدرت کا ایسا کارساز پرزہ ہے جس کا ادراک ناممکن ہے اس پر سونے پر سہاگہ کہ تخیلاتی و تصوراتی دنیا انسان کے لیے پل بھر میں زمین و آسمان کے فاصلے مٹا دیتی ہے۔فرحت نے انسان کی اسی خیالی دنیا کی وسعت و بلندی سے مستفید ہوتے ہوئے اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ فرحت نے دامِ خیال میں دنیا کو آئینہ دکھایاہے اوردنیا کے معاملات کا نقشہ شوخ مزاج کی عینک اتار کر ہمدردانہ نظروں سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔دامِ خیال میں فرحت کا مزاج ایک فلسفی، رہبر اور سائنس دان کی صورت نظر آتا ہے۔

فرحت کے دوراندیش دماغ نے دل کو رہبر مان کر موجودہ دنیا کا جو عکس دکھایا وہ بہت المناک تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''روحانیت کا گنبد جس کے کلس عر ش کے ستونوں سے جا ملے تھے اب گھٹتے جا رہے ہیں۔ مادیت کا گنبد ہے جس پر لوگ خوشامد، لالچ، سفارش کے زور پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ گنبد کے اندر کی حالت مزید دگرگوں ہے کہ اس میں طرح طرح کے کارخانے ہیں۔ کارخانہ جراثیم آوارگی ہے۔''(۲۸)

جس میں جلانے کے لیے ایندھن کے طور پر بقول فرحت

''عصمت کی چادریں، عفت کے برقعے اور حیا کی نقابیں جلانی پڑتی ہیں۔ ''(۲۹)

فرحت کا قلم دنیا کا سچ دکھانے پر آتا ہے تو بے باک ہوجاتا ہے سچ پنپتا نہیں اور جھوٹ کی انتہا نامعلوم، جھوٹ کے کارخانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سچ کے جراثیم ایسے تلخ ہیں کہ لوگ ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔جھوٹ کے جراثیم کی آمیزش سے ایک نیا کیڑا پیدا ہوگیا ہے اس کو یہاں کی اصطلاح میں مصلحت آمیز کہتے ہیں۔ اس کا سپرم دنیا والوں کو کچھ ایسا راس آیا ہے کہ کیا کروں۔ بنڈل کے بنڈل چلے جارہے ہیں۔بس نہیں ہوتے۔''(۳۰)

مزید لکھتے ہیں:

''یہاں پہلے قناعت کا بھی بڑا کارخانہ تھا مگر اب اس کو ہوس کے کارخانے نے خرید لیا ہے۔ انصاف کا کارخانہ دولت کے کارخانے کے ساتھ آگیا اور نیکی کا کارخانہ ریا کاری کی کمپنی میں ضم ہو گیا۔''(۳۱)

سچائی، قناعت اورخلوص جس کی بنیاد پر انسان خلیفہ کائنات ہے اور جو اس کا وصفِ اولین ہونا چاہئے تھے اب متروکہ املاک بنتے جا رہے ہیں۔ سچائی، صبر، قناعت،خلوص اورایمانداری کے وصف اب چیدہ چیدہ خانہ خرابوں کے ہاں ہی نظر آتے ہیں۔ فرحت نے ان اوصاف کی ناقدری کا المیہ اور طنزیہ پیرایہ میں اظہار کسی ماہرِ نفسیات اور ماہر معالج کی طرح تشخیص کرکے کیا گیاہے۔

صاحب بہادر

انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کا المیہ ہے کہ ہندوستانی آدمی جس کے پاس ذرا دولت بھی ہو تو وہ کیوں نہ قدامت پرستی چھوڑ کر ماضی سے منہ پھیر کر نئی راہ لے بیشک نئی راہ اس کے لیے پل صراط ہی کیوں نہ ہو؟ چھریوں،کانٹوں، پتلونوں سے لیس ہی کیوں نہ ہو؟چاہے اسے اپنے آرام دہ لبادے کو چھوڑ کر تنگ و چست کوٹ پتلون پہننے پڑیں لیکن پھربھی نئی تہذیب

کے دلدادہ،اس راہ پر خطر اور خاردار پر چلنے کو ہر دم تیار ملتے ہیں۔ فرحت نے صاحب بہادر میں نئی تہذیب و اقدار میں گھس بیٹھنے کی اس خواہش کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہاں فرحت کا اسلوب شوخ و چنچل شرارت لیے ہوئے ہے اور طنز کے تیروں سے زخمی نہیں کرتا۔

مضمون کہانی میں انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ان کے زندگی سے متعلق نظریات سے آگاہی ہوتی ہے کہ وہ زندگی سے متعلق کس قدر مثبت اور خوش دلانہ روّیہ رکھتے تھے گو کہ ان کی نجی زندگی تکلیفوں اور مصیبتوں کے بشرانہ وصف کے عین مطابق گزری تھی لیکن پھر بھی تمام عمر وہ خوش رہنے اور رکھنے پر عمل پیرا رہے۔ زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں، زندہ دلی اور مردہ دلی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کا اصل فلسفہ اسی خوش دلی اور قنوطیت میں مضمر ہے۔ خوش دلی اور قنوطیت انسانی زندگی کے دوایسے رخ ہیں جو ردودبدل کے ساتھ انسان پر حاوی رہتے ہیں لیکن انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتالیکن تب تک، جب تک وہ خود کو اپنے حال پر خوش رکھنا نہیں چاہتا اورجب اس میں زندہ دلی کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے پھر اسے ہر شے میں نغمہ بہار سنائی دیتا ہے اور اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہتی کہ وہ ہجر زدہ درختوں میں درماندہ فضا کو چھوڑ کر ٹہنیوں کی رگوں میں پلتے ہوئے نئے پھولوں اور پتوں کے ٹنڈ منڈ سے متعلق سوچ کر خود کو آزردہ کرنے کی بجائے آسودہ کرے۔فرحت نے اس مضمون میں موسموں کے بیان سے موسمی حقیقت نگاری، سچائی اور لطیف صداقتوں کے رنگ بھرے ہیں۔ ایک طرف بہار،خزاں، گرمی، سردی کی اپنی اپنی خصوصیات گنوائی ہیں تو دوسری طرف انسان کو دعوتِ فکر و عمل دی ہے کہ وہ ہر موسم کو اس کے حقائق کے ساتھ قبول کرے اور لطف اندوز ہو۔ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں میں سے موسم اور ان کی دلکش لطافتیں اورسنگین شدتیں بھی ایک حقیقت ہیں۔ فرحت انسان کو درس دیتے ہیں کہ وہ حقائق کو تسلیم کرے اور جو وقت بھی اس پر گزر انِ حال ہے اس کی قدر کرے اور اس راحت کو غنیمت جانے، جو مصیبت سے پہلے آتی ہے۔ فرحت نے مضمون میں دو ایسی بوڑھی عورتوں کی متفرق نفسیات بیان کی ہے جو زمان و مکان کے تغیر و تبدل کے کئی سال گزار کر نہ صرف موسموں کی سختیوں اورتلخیوں سے بخوبی آشنا ہیں بلکہ ان کو جان و دل پر سہ بھی چکی ہیں۔ اپنی شکر کی نعمت سے ایک نے عزت پائی اور دوسری نے کفرانِ نعمت کی عادت کے سبب خستہ حالی اور بربادی۔ انسانی فطرت کا یہی المیہ مضمون کی تہہ میں رواں ہے کہ بیشتر انسان اپنے ناشکرے پن سے اپنے حال کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔فرحت نے انسان کو خوش دلی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

<u>نئی دلی</u>

نئی دلی مضمون لکھ کر گویا فرحت اللہ بیگ نے دل کی پھانس نکال لی جونئی تہذیب نے دلی کے سینے میں چبھوئی تھی۔ ہر بات جو پرانی دلی کا خاصا تھی اب نئی دلی میں کم تر ہو کر رہ گئی تھی۔ پھول والوں کی سیر میں جہاں صیغہ حال تھا اب وہاں کی ہر بات صیغہ ماضی میں سناتے ہیں۔ فرحت کی ماضی پرستی،ماضی کی یاد انھیں بے چین رکھتی ہے۔

قطب کی لاٹھ، پھول والوں کی سیر، میلے ٹھیلے، کھانے پینے، طورطریقے غرض کہ دلی کی شان اوردلی کی زبان اردو بھی اپنا کمال اور مقام کھو رہی تھی اس کی وجہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں پیش آنے والے واقعات اور مسلمانوں پر ہوئے یک طرفہ ظلم و ستم کا المیہ ہے کہ اب دلی میں ہر طرف غیروں کی آوازوں کا راج تھا۔

آگے توپ، پیچھے توپ ہے، سامنے فوج ہے، پیچھے فوج ہے، سپاہی ہیں کہ ڈانڈے بجا رہے ہیں۔ ایک غل مچ رہا ہے کہ بڑھے چلو، چڑھے چلو۔ (۳۲)

عبد الحئی صدیقی مضامین فرحت اللہ بیگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کے مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصلاحی ہیں۔ جس سے معاشرتی اور سماجی نقائص کو دُور کرنا ان کامقصود تھا۔ مرزا کی ظرافت زبان اور اندازِ بیان کی ظرافت ہے۔ واقعات کی ظرافت ہے۔ ان کی ظرافت فطری ہے۔ بے ساختگی ان کی نمایاں ترین

خصوصیت ہے اور حقیقت میں یہی کامیاب ترین ظرافت بھی ہے۔‘‘(۳۳)

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ فرحت اللہ بیگ کے بہت سے مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ہیں جن میں فرحت نے ذاتی و نجی تجربات و مشاہدات کے بیان کے ساتھ اخلاقی و کرداری سطح پر فرد اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر بظاہر اپنے شوخ و شیریں انداز میں کرنے کی کوشش کی لیکن باطن میں اوّل تا آخر بہرحال فردکو انفرادی و اجتماعی طور پر جن مسائل و مصائب اور رنج و الم کا سامنا ہے ان کو بڑی دردمندی اور ہمدردی سے بیان کیا ہے۔ افراد معاشرہ سے محبت اور فن کے تئیں آپ کی صداقت نے بلاشبہ آپ کے مضامین کو اردو طنز و مزاح میں اعلی مقام پر فائز کر دیا ہے۔ آپ کے دیگر قابل ذکرمضامین میں گڑیا کی شادی،بے تکلفی،لیلیٰ مجنوں، مولوی صاحب کی بیٹی،مہینے کی پہلی تاریخ،میری بیوی، پیچ در پیچ جینے سے مرنا بہتر،دو دیوانے اور کم سنی کی شادی نہ صرف اپنے موضوعات کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں بلکہ فنی و فکری حوالے سے ا ردو طنزومزاح کے المیاتی پہلووں کوبھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔فرحت اللہ بیگ کی ظرافت میں ادبی و صحافتی دونوں رنگوں کا تال میل موجود ہے،پر گفتگو مجھے عوام سے ہے،عوامی لہجہ بھی اپنی جھلک دکھا جاتا ہے، ادبی و کلاسیکی انداز بھی واضح ہے؛ بات موضوع کی آ جاتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہر موضوع اپنا اسلوب خود لے کر آتا ہے، ان کی تحریر میں مزاحِ لطیف کی کمی نہیں ہے اور دیدۂ نمناک بھی مناظر کو دھند لا دیتے ہیں۔دونوں صورتوں میں ظرافت و الم کے قرائن و آداب ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ فرحت اللہ بیگ،مضامین فرحت،مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،لاہور،مطبہئ عرفان افضل،۲۰۱۱ء،ص۲۳۳
2۔ فرحت اللہ بیگ،نذیر احمد کی کہانی،کچھ میری کچھ ان کی زبانی، مرتبہ رشید حسن خان،نئی دلّی، انجمن ترقی، اُردو، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲
۳۔ ایضاً،ص ۲۳
۴۔ ایضاً، ص۲۳
۵۔ ایضاً،ص ۶۰
۶۔ ایضاً، ص ۳۵
۷۔ ایضاً، ص ۳۵
۸۔ ایضاً، ص۳۵
۹۔ ایضاً، ص۶۲
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۱
۱۱۔ ایضاً، ص۷۳
۱۲۔ فرحت اللہ بیگ،مرزا،دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ،علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۳۶ء، ص ۴
۱۳۔ فرحت اللہ بیگ، مرزا،مضامینِ فرحت،مرتبہ ڈاکٹررفیع الدین ہاشمی،لاہور،عرفان افضل پرنٹرز،۲۰۱۱ء، ص۲۰
۱۴۔ فرحت اللہ بیگ،مرزا،دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ، ص۲۹
۱۵۔ ایضاً،ص ۳۰
۱۶۔ ایضاً،ص۳۱
۱۷۔ ایضاً،ص ۸۶
۱۸۔ ایضاً،ص ۸۶
۱۹۔ ایضاً،ص۸۶
۲۰۔ فرحت اللہ بیگ،مرزا،بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر،دہلی،کتب خانہئ علم و ادب،۱۹۳۵ء، ص ۳
۲۱۔ ایضاً، ص۵۶
۲۲۔ فرحت اللہ بیگ، مرزا،مضامینِ فرحت،مرتبہ ڈاکٹررفیع الدین ہاشمی،ص ۱۹۷
۲۳۔ ایضاً،ص۲۱۰
۲۴۔ ایضاً،ص۲۱۲
۲۵۔ ایضاً،ص ۲۱۲
۲۶۔ ایضاً،ص ۲۴۲
۲۷۔ ایضاً، ص۲۴۸
۲۸۔ ایضاً،ص ۲۴۸
۲۹۔ ایضاً،ص ۲۴۸
۳۰۔ ایضاً،ص۲۴۸
۳۱۔ ایضاً،ص۲۴۸
۳۲۔ ایضاً،ص ۲۷۸
33۔ عبدالحئی صدیقی،مرزا فرحت اللہ بیگ حیات و ادبی خدمات،نئی دہلی، پبلشرز ڈاکٹر عبدالحئی صدیقی،ص ۲۳۱